Rs. 15/-

ستمبر ۲۰۱۲

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

سمندر کو بھی کچھ نہ سمجھے گی......"

"سلمیٰ! تمھاری یاد، تمھاری مسکراہٹ، پُرسکون لہجہ ہی تو میرا سرمایۂ حیات ہے، تم یقین جانو تمھاری تصویر جو دل کے نہاں خانے میں سجی ہے جو مجھے جینے پر مجبور کرتی ہے۔ سلاخوں سے پرے جب صبح نو کا ہنگامہ برپا ہوتا ہے تو تمھاری یاد کو سینے سے لگائے سلاسل پہ سر رکھے پُرسکون نیند آجاتی ہے......"

لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ ہجرت ایک سیدھا سادہ اقتصادی مسئلہ ہے اور بس۔ مگر جانے میں کیوں مطمئن نہیں ہوتا ہوں۔ شاید اس لیے کہ میں اپنے دو بیٹے اس مسئلے کی بھینٹ چڑھا چکا ہوں۔ میں کوہ ندا کا اسرار جاننا چاہتا ہوں، اس صدا کے طلسم سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں جو رشتوں کو بے معنی بناتی ہے، سننے والوں کو بھی ہر طرح کے خوف اور اندیشے سے آزاد کردیتی ہے، مگر میری الجھن یہ ہے کہ جو بھی اس صدا پر کھنچتا چلا جاتا ہے، وہ لوٹ کر نہیں آتا۔

ایک ہفتہ پہلے اچانک میں زلزلے کی زد میں تھا سلمیٰ! جانتی ہو کیا ہوا؟ تمھارا چھوٹا بیٹا دو دن کے لیے اچانک آگیا۔ نہیں — نہیں، خوش مت ہونا وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ شاید کہیں دوسرے ملک جارہا تھا راستے میں اس کے باپ کا ملک بھی تھا۔ کسی مجبوری کی بنا پر اسے رکنا پڑ گیا، پھر ایک دن کے بعد وہ چلا گیا۔ جاتے وقت مجھے مشورہ دے رہا تھا، وہ کہنے لگا — "سلمیٰ! اُسن سکوگی؟ وہ مجھ سے کہنے لگا — سلمیٰ! کیسے کہوں کہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ میں نے کہا —

"ابا! آپ کا جی گھبراتا ہوگا۔ آپ کو اک ساتھی کی ضرورت ہے۔ آپ دوسری شادی کر لیجیے اور وہ چلا گیا یعنی اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا، مجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھا زمین پر پٹخ دیا۔ میں پورے بدن سے لرزنے لگا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے میں گیا کہ کہوں — سلمیٰ! تم گواہ رہنا کہ اس نے مجھے کتنی بڑی گالی دی ہے مگر — مگر یہ کیا! تمھاری تصویر تو میز سے زمین پر گری پڑی تھی۔ فریم کا شیشہ ٹوٹ کر بکھرا ہوا تھا تو گویا تم بھی یہ جھٹکا برداشت نہ کرسکیں! میں نے شیشے کی ایک ایک کرچی الگ کی اور تمھاری تصویر کو چومتا رہا، روتا رہا، روتا رہا اور پھر اگلے دن اعصاب قابو میں آئے تو تصویر فریم کرواکے سرہانے رکھ لی۔ بھیگی پلکوں پہ سمٹ کر داستان خاموش ہوگئی۔ جیسی اب ہے میری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی۔

دنوں کی کم زوری کے بعد میں کھڑا آسمان پر اک خواب جلنے کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ کور چشم دوش پہ حقیقت کا جنازہ لیے — مجاز نے آنکھ کھولی تو اسے یمین و یسار میں اپنے چہرے نظر آئے۔ سہا تو آنکھوں میں دہشتیں ناچ اٹھیں۔ جنھوں نے ہنسی کو دریا میں ڈبو دیا۔ لیکن اک سراب میرے حلقوم میں اٹک گیا ہے۔ ایک حقیقت ذہن کے گنبد میں ناچ رہی ہے۔ میں تو نور کی جستجو میں گور کی ظلمت سہہ لوں گا لیکن حرفِ شکایت زبان پہ لانے کے بجائے ہر بار چیخوں گا — مجھے قطع عن الغیر کا حوصلہ دے یارب — مجاز — یہ خواب — یہ سراب — ترک......ترک......ترک!! ☆☆☆

سدھا اوم ڈنگرا
مترجم: خان احمد فاروق

کون سی زمین اپنی

"ارے میں نے اپنا بڑھاپا یہاں نہیں کاٹنا، یہ جوانوں کا دیش ہے، میں تو پنجاب کے کھیتوں میں، اپنی آخری سانسیں لینا چاہتا ہوں۔"

وہ جب اپنے بچوں کو یہ کہتا، تو بیٹا جھگڑ پڑتا...... "اپنے لیے آپ کچھ نہیں رکھ رہے اور گاؤں میں زمینوں پر زمین خریدے جارہے ہیں۔"

وہ مسکرا کر کہتا...... اوے پتر، تو اور تیری بہن نے میرا سر اونچا کردیا ہے۔ امریکہ میں میری محنت کامیاب کردی ہے۔ میں نے آسمان چھولیا ہے، تو ڈاکٹر بن رہا ہے اور تیری بہن وکیل بیٹا جی، اس سے اوپر تو مجھ اور کچھ نہیں چاہیے، تم نہیں سمجھ سکتے، ابھی باپ نہیں بنے ہونا"۔ بیٹا بحث کرتا وہ سب ٹھیک ہے پاپا جی، پر ایک گھر تو بنوالیں۔ ساری عمر دو بیڈ روم والے ٹاؤن ہاؤس میں گذار دی۔ کل کو ہمارے بچے آپ کے پاس آئیں گے تو کہاں کھیلیں گے۔

پتر جی، پنجاب کے کھیتوں میں بڑا کھلا گھر بنواؤں گا۔ وہاں کھیلیں گے۔ جب ہم یہاں سب سے ملنے آئیں گے۔ تب تیرے اور تیری بہن کے پاس رہیں گے۔ وہاں کھیلنے کے لئے کافی جگہ ہوگی۔

بیٹا ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتا۔ بے بس سر جھٹک کر بدبداتا گھر سے باہر نکل جاتا...... "ہی ول نیور چینج"

منوندر بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ دار جی اور بی جے کی چھٹی آتے ہی منجیت سنگھ سودھی، نواں شہر (پنجاب) میں اپنے بھائیوں کو زمین خریدنے کے لئے پیسے بھیج دیتا تھا۔ منوندر تڑپ کر رہ جاتی۔ سمجھانے کی سب کوششیں بے کار ہو جاتی تھیں۔ "سنگھ صاحب گھر کے خرچ کی طرف بھی دھیان دیجیے۔ ٹھیک ہے بچے اسکالرشپ پر پڑھ رہے ہیں پر ان کے اور بھی تو اخراجات ہیں۔ چار کاروں کی قسطیں جاتی ہیں، اتنی زمین خرید کر کیا کریں گے......؟"

"منوندر کورے! جاٹ کی پہچان زمینوں سے ہوتی ہے"۔ بڑے فخر سے چھاتی چوڑی کر کے منجیت سنگھ کہتا۔

یہی بات جھگڑے کی شکل اختیار کر لیتی ۔ ’’پر کتنی پیچان سردار جی، کہیں تو ختم ہو۔ برسوں سے آپ کے گھر والے زمینیں ہی تو خرید رہے ہیں۔ پیسوں کا کوئی حساب کتاب نہیں۔ یہاں زمین بک رہی ہے وہاں زمین بک رہی ہے۔ یہ ٹکڑا خرید لو۔ گاؤں کی سرحد سے لگے کھیت لے لو۔ کلے پر کلے جمع کرتے جا رہے ہیں۔‘‘ منوندر کا پارہ چڑھتے دیکھ منجیت گھر سے باہر دوڑ لگانے چلا جاتا اور پھر دوسرے دن ہی ایک چیک پنجاب نیشنل بینک میں دار جی کے نام بھیج دیتا۔ منوندر بس رو کر رہ جاتی۔

روئی، تو وہ تب بھی تھی۔ جب منجیت سنگھ سوڈھی سے تیس برس پہلے شادی ہوئی تھی۔ جب کہ اس کا پورا خاندان امریکہ میں تھا۔ پھر بھی وہ روئی تھی۔ دادا دادی کو چھوڑتے وقت۔ منوندر کے دو بھائی یوبا سٹی (کیلی فورنیا) کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ ناجائز طریقے سے وہ امریکہ میں آئے تھے میکسیکن لڑکیوں سے شادی کر جائز ہو گئے تھے یعنی گرین کارڈ ہولڈر پانچ سال بعد امریکی شہری بن کر انھوں نے اپنا پورا خاندان بلا لیا تھا۔ تب امیگریشن کے قاعدے قانون اتنے سخت نہیں تھے۔ جتنے اب ہیں۔ چھ فٹ لمبے، کسرتی اور گٹھے ہوئے گورے خوبصورت سکھ، منجیت سنگھ کو دادا دادی نے ہی تو پسند کیا تھا۔ ماں باپ اور دو چھوٹے بھائی تھے اس کے۔ غریب گھر کے بیٹے کو جان بوجھ کر پسند کیا گیا تھا تاکہ منوندر کی قدر کر سکے۔ نوجوان منجیت سنگھ منوندر کے ساتھ آنسو بہاتا امریکہ آ گیا تھا۔

منجیت زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اور منوندر نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بھائیوں کی طرح اس کا شوہر بھی کھیتوں میں کام کرے۔ شادی سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو سمجھا کر، قائل کر کے، اس نے ان سے بینک میں پیشگی رقم ڈاؤن پیمینٹ کی شکل میں دلوادی تھی۔ اور گیس اسٹیشن کا قرض لے کر کیری ((شمالی کیرولائنا) میں گیس اسٹیشن بھی خرید لیا تھا۔

شادی کے بعد بھارت سے وہ سیدھے کیری ہی آئے تھے۔ منجیت سنگھ کو جب تک گرین کارڈ نہیں ملا، منوندر گیس اسٹیشن کے بزنس میں اہم کردار ادا کرتی رہی اور بعد میں منجیت سنگھ سوڈھی اس کا مالک بن گیا۔ منوندر سلائی کڑھائی میں ماہر تھی۔ گیس اسٹیشن منجیت کے حوالے کر کے، اس نے اسی وقت امریکی دلہنوں کے کپڑے سلنے کی دکان شروع کر دی، جو بعد میں Wedding Gown Boutique بن گیا۔ بوٹیک بہت چل نکلا اور اس کا کام اتنا بڑھ گیا کہ بیس لوگ منوندر کے ساتھ کام کرنے لگے، کچھ ہندستانی نژاد تھے اور کچھ مقامی۔ اپنی پرکشش شخصیت اور نرم گفتار کی بدولت منجیت سنگھ کیری شہر کے سبھی فرقوں کے لوگوں میں مقبول ہو گیا۔ تب گنے چنے ہندستانی تھے۔ اب تو ہر طرف ہندستانی نظر آتے ہیں۔ لوگ انھیں پیار سے ویر جی اور منوندر کو بھابھی کہنے لگے تھے۔

تب سے اب تک منجیت کا ایک ہی خواب رہا کہ بڑھاپا بھارت میں ہی گزارنا ہے۔ منوندر منجیت کی اس خواہش کے آگے مجبور ہو چکی تھی۔ عمر کے اس مقام پر وہ بھارت جانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ ملک اسے

اپنا سا لگتا۔ اس کا پورا خاندان امریکہ میں پھیلا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ پلے بڑھے دوست، برسوں پہلے بنائے رشتے، جو وقت کے ساتھ بہت مضبوط ہو چکے تھے۔ یہ سب کچھ چھوڑ دینا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ یہ رشتے جنم سے ملے رشتوں سے کہیں گہرے تھے۔ زندگی کی کڑی دھوپ، برسات اور ٹھنڈک نے انھیں پکا دیا تھا۔ بھارت کے رشتوں کے لیے وہ بس مہمان بن کر رہ گئے تھے۔ جو سال یا دو سال میں ایک بار انھیں رشتہ دار ہونے اور اپنے پن کا احساس دلاتے تھے۔ منجیت آج بھی تیس سال پرانے رشتوں میں ہی جی رہا تھا۔ بدلتا وقت بھی اس کی سوچ اور رشتوں کے تئیں نقطہ نظر میں کوئی فرق نہیں پیدا کر سکا۔ بھارت کی ترقی اور بدلتی فضا بھی اس کی ٹھہری سوچ کے تالاب میں کنکر پھینک کر لہریں پیدا نہیں کر سکی تھا۔ منجیت کو سمجھانا منوندر کے لیے مشکل ہو رہا تھا، وہ ہر وقت تناؤ میں رہنے لگی تھی۔

بچوں کی شادیاں ان کی پسند کی ہو گئیں تو منوندر نے سوچا کہ شاید اب منجیت کی عادتوں میں کوئی تبدیلی آ جائے۔ گھر میں بہو اور داماد آ گئے ہیں پر منجیت اپنے آپ کو ہر ذمہ داری سے آزاد سمجھنے لگا اور من ہی من پنجاب گھومتا رہتا۔ اپنے کھیتوں میں پہنچ جاتا۔ تینوں بھائی گنے کے کھیتوں میں گھومتے، گنے چوستے، پھر گنے کے رس سے دار جی گرم گرم گڑ بناتے اور تینوں بھائی گرم گرم گڑ کی بھیلی سوکھی روٹی کے ساتھ کھاتے، شکر میں ایک چمچ دیسی گھی اور ڈلوانے کی منجیت ضد کرتا۔ چھوٹے بھائی بلبلا کر، پیر پٹک پٹک کر، اپنی کٹوریاں بے جی کے آگے کرتے۔ ایسے میں بے جی بڑی سمجھداری سے دونوں چھوٹوں کو پیار سے سہلاتیں، مسکراتے ہوئے کہتیں......’’منجیت میرا جیٹھا پتر ہے اس نے وڈا ہو کے سانو سب نوں سنبھالنا ہے۔ اس نو طاقت دی بہت ضرورت ہے۔‘‘ اور دونوں چھوٹوں کی کٹوری میں آدھا آدھا چمچ گھی ڈال دیتیں۔ سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی پروستے وقت بھی بے جی ہانڈی میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر مکھن، اس کے ساگ پر ڈال دیتی اور لسی کے چھنّے کو بھی مکھن سے بھر دیتی تھیں۔ چھوٹوں کو وہ آدھے ہاتھ کے مکھن میں ہی ٹال جاتیں۔

نیند میں بھی منجیت گاؤں والے گھر پہنچ جاتا۔۔۔۔ جدید سہولتوں سے سجا، پکا گھر، ٹریکٹر نوکر چاکر اور بے جی کا بار بار منجیت کی پیشانی چومنا، چھوٹوں کا گلے لگنا اور ساتھ لگ کر بیٹھنا، دار جی کا اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گردن اکڑا کر، اپنے دوستوں کو سنانا......’’پتر ہووے تاں منجیتے ورگا، امریکا جا کے وی اینہ سانوں نہیں بھولیا۔ ساڈا پیٹ بھر گیا، پر اینہ ڈالر بھیجتا نہیں تھکیا...... زیناں جٹاں دا سوابھیمان ہوندا......میرے پتر نے میرا مان رکھیا۔‘‘ (بیٹا ہو تو منجیت جیسا، امریکہ جا کر بھی ہمیں نہیں بھولا۔ ہمارا پیٹ بھر گیا، پر یہ ڈالر بھیجتے نہیں تھکا۔۔۔۔ زمینیں تو جاٹوں کا غرور ہوتی ہیں۔ میرے بیٹے نے میری عزت رکھ لی۔)

صبح منجیت تروتازہ اور توانائی سے بھرپور اٹھتا۔ سارا دن اسی ترنگ میں رہتا کہ اتنا پیار کرنے

والے خاندان میں بڑھاپا کتنا عمدہ گذرے گا۔ بیٹا بیٹی تو اپنی زندگی میں مصروف ہو گئے ہیں۔ کبھی سوچتا کہ زمینوں کے دو چار قطعے بیچ کر گاؤں کا اسکول ٹھیک کروادوں گا۔ دیواریں کافی گر گئیں ہیں، کچھ کمپیوٹر بھی لے دوں گا۔ بچوں کو پڑھائی کی سخت ضرورت ہیں۔ اس کو ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا، تو امریکہ میں، اتنی سخت محنت نہیں کرتا۔ ڈاکٹر سائنسداں، انجینئر بن کر وہ بھی آرام دہ زندگی گزارتا۔

منجیت اپنے آپ سے باتیں کرتا۔ ''دار جی نہیں مانیں گے، وہ گرو گھر کو چندہ دینا چاہیں گے۔ بے جی کو سمجھا کر انھیں بھی منالوں گا۔''

خوش کن احساسات اور بھارت لوٹنے کی چاہت میں وہ دن گن رہا تھا۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا۔ منجیت کو گیس اسٹیشن خریدنے والا مل گیا۔ پارٹی ایسی تھیں جس نے ان کا بوٹیک بھی خرید لیا تھا۔

بس اب جلدی جلدی گھر کا سارا سامان گیرج سیل میں رکھا گیا اور کچھ سامان بچے لے گئے۔ جو نہیں بکا، اسے ویتنام ویلفیئر والے اپنے ٹرک میں اٹھا کر لے گئے۔

منجیت کو امریکا میں دن کاٹنے مشکل ہو رہے تھے اور منوندر اداس پریشان رہنے لگی تھی۔ اس کے سر میں بھی ہر وقت درد رہنے لگا۔ بات بات میں جھگڑنا معمول ہو گیا تھا۔ منجیت کے مضبوط ارادہ کے آگے بھارت جانے کی وہ کھل کر مخالفت نہیں کر پا رہی تھی۔ خاموشی سے مشینی انداز میں وہ سارے کام کر رہی تھی۔

''بینک جا کر میں سارا پیسہ پہلے ہی وہاں گھر والوں کو بھجوا دیتا ہوں تاکہ جاتے ہی کام شروع کروادوں۔ منجیت کی اس بات سے منوندر کے اندر کی آگ آتش فشاں بن کر پھٹ پڑی۔ خبردار! سردار منجیت سنگھ، اگر پیسہ کو ہاتھ لگایا۔ میں اور میرے بچے بھی آپ کا خاندان ہیں۔ صرف پنجاب میں آپ کا خاندان نہیں بستا۔ اور آپ تو برسوں سے کہتے ہیں کہ وہاں کچھ زمین بیچ کر سارے کام پورے کریں گے۔ کل ہی میں جا کر اسے وکوویا بنک میں جمع کروادوں گی سی ڈی میں۔''

منوندر کی کڑک آواز بھی منجیت کو اس کے ارادہ سے روک نہیں سکی اور وہ اپنے میٹھے لہجے میں پھر بولا۔ سردارنی جی، اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ ہم نے اس دیس میں واپس تھوڑے ہی آنا ہے۔ گئے تو گئے پلٹ کر کیا دیکھنا۔

منوندر غصہ میں بولی۔ کیا بچوں سے ملنے نہیں آئیں گے؟ تب ان سے مانگیں گے۔ پوتے پوتی، نواسے نواسی کو گفٹ دینے کے لیے بچوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے۔ وہ شانت لہجے میں بولا۔ او میرے ہیرے، اپنے رانجھے کی بات غور سے سن، ہمارے بچوں کو اس پیسے کی ضرورت کہاں، ڈاکٹر اور وکیل کے پاس تو رب کی مہر ہوتی ہے۔ گفٹ ہم پنجاب سے لائیں گے۔

منوندر کا صبر اب جواب دے گیا، نواں شہر میں اس پیسے کی ضرورت ہے؟ جہاں زمینوں کی قیمتیں آسمان چھو رہی ہیں۔ اپنی ضد پر اگر اڑے رہے تو آپ اکیلے ہی بھارت جائیں گے۔ میں یہاں اسی ٹاؤن ہاؤس میں رہ، بچوں سے ملنے جاتی رہوں گی اور آپ پنجاب میں اپنے خاندان کے ساتھ بڑھاپا گذارنا۔

یہ سنتے ہی منجیت ڈھیلا پڑ گیا۔ منوندر کی شخصیت کے اس پہلو سے وہ واقف تھا۔

بلاوجہ وہ ناراض نہیں ہوتی، پر اگر کوئی فیصلہ وہ کر لے، تو اسے منانا بھی آسان نہیں۔

آسان تو منجیت کو کچھ بھی نہیں لگ رہا تھا۔ دو دن بعد کی واپسی ہے اور ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو رہا ہے۔ دل کھیتوں کی روشوں پر جھوم رہا ہے اور جسم یہاں گھسٹ رہا ہے۔ پنجابیوں اور دوسرے فرقے کے لوگوں نے الوداعیہ دیا پر منجیت نے صرف رسم نبھائی۔ منجیت کا دل امریکا سے اچٹ گیا تھا۔

اس نے کیری سے نیویارک اور نیویارک سے دلی تک کا سفر ایئر انڈیا جہاز میں سو کر یا فلم ''رب نے بنائی جوڑی'' دیکھ کر گذارا۔ ٹاؤن ہاؤس کو بیچا نہیں گیا۔ بچوں نے ضد کر کے اس منطق کے ساتھ کہ ان کا بچپن اور جوانی اس میں بیتے ہیں، اسے اپنے لیے رکھ لیا تھا۔ فی الحال اسے کرایہ پر اٹھا دیا گیا۔ مکان کرایے دار کو سونپنے اور سامان کی پیکنگ کرنے میں منوندر بہت تھک گئی تھی۔ وہ تو سارے راستہ سوتی رہی۔ دونوں کی آپس میں کوئی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔

منوندر کئی دنوں سے گم صُم تھی۔ کام کی بات کرتی۔ منجیت کچھ پوچھتا، بس اسی کا جواب دیتی۔ اس سے زیادہ نہیں بولتی۔ پر اس کے پاس منوندر کی طرف دھیان دینے کا وقت ہی کہاں تھا۔ وہ تو بھارت جانے کے سرور میں مست تھا...... جہاز میں بھی اسے احساس نہیں ہوا کہ منوندر کس ناقابل بیان تکلیف سے گزر رہی ہے۔ فلم دیکھ کر وہ سو گیا۔

منوندر کو پیاس لگی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایئر ہوسٹس سے اس نے پانی منگوایا۔ ساتھ کی سیٹ پر بچوں کی طرح بے خبر سوئے منجیت کو وہ بغیر پلک جھپکائے دیکھتی رہی۔

اِس کے پیار کی خاطر وہ گرہستی کی تنکلی پر بٹتی رہی، پر کبھی اف نہیں کی۔۔۔ اب تو اُس کے احساسات بھی تار تار ہو چکے ہیں...... وہ بس زندگی کی چرخی سے لپٹی ہوئی بسر کیے جا رہی ہے۔ اور اِسے خبر بھی نہیں ہے۔ آدمی اپنی دھن میں عورت سے اتنا بے خبر کیسے ہو جاتا ہے...... جس سے پیار کرتا ہے، اس کی اگنی پرکشا لیتے ہوئے، اس کا دل کیوں نہیں دکھتا...... دادی کہتی تھیں، آدمی کی ضد بچوں کی سی ہوتی ہے، پیار سے منا لیتے ہیں...... پر یہاں تو پیار، غصہ، کچھ کام نہیں آیا...... سوچوں نے اس کا سر بھاری کر دیا اور تھکان بھی جسم کو نڈھال کرنے لگی، نیند حاوی ہو گئی...... اس نے سر اٹھایا، جہاز کی کھڑکی کے ساتھ ٹکایا اور ٹانگوں کو اپنی چھاتی کے ساتھ لگا کر کرسی پر گٹھری سی بن کر، سرہانے سے ٹیک لگا کر کمبل اوڑھ کر سو گئی۔

جیسے ہی جہاز نے اندرا گاندھی ایئر پورٹ پر رن وے چھوا، منجیت سنگھ کی آنکھوں میں آنسو

آ گئے۔ ''تیس برسوں کی قید سے چھوٹ کر آ رہا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے نیپکن سے اپنے آنسو پونچھے۔ منوندر کھڑکی سے باہر ایئرپورٹ کی چہل پہل دیکھتی رہی۔ کسٹم کے معاملات نمٹا کر اب سردار منجیت سنگھ اور بی بی منوندر کور باہر نکلے تو بھتیجوں نے فتح کا نعرہ لگا کر استقبال کیا۔ منجیت کا دل باغ باغ ہو گیا...... دو بھتیجے وین لے کر آئے تھے۔ دلی سے نواں شہر جانے میں پانچ گھنٹے لگے۔

اوبڑ کھابڑ سڑکوں کے دھچکے، چاروں طرف اڑتی دھول دیکھ پہلی بار منوندر بولی...... ''بھارت کتنی بھی ترقی کر لے۔ سڑکیں کبھی نہیں ٹھیک ہوں گی...... آلودگی تو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔''

منجیت نے بیچ میں ہی بات کاٹ دی۔ ''سونیوں اپنے دیس کی دھول مٹی کا بھی آنند ہے۔ تیس برسوں سے گوروں کی دھرتی پر مٹی کا سکھ بھی نہیں ملا۔''

''تایا جی! وہاں بالکل دھول نہیں ہوتی۔ کیسے اتنی صفائی رکھتے ہیں؟'' بڑے بھتیجے سکھ بیر نے پوچھا۔

''امریکا بڑی پلاننگ کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں ملیں گی یا صاف ستھری سڑکیں، کھلی جگہ تو بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ خالی جگہ کو بھی گھاس اور پھولوں سے بھر دیتے ہیں۔ تاکہ دھول نہ اڑے۔''

''پر تایا جی، سڑکوں کی مرمت کرتے وقت اور عمارتیں بناتے وقت تو گندگی پھیلتی ہی ہو گی دھول مٹی اڑتی ہو گی۔''

''پتر جی، ان کے کام کرنے کے ڈھنگ بھی بڑے عجیب ہیں۔ ایک ٹرک پھیلا بکھرا ہوا سامان اٹھا لے جاتا ہے اور دوسرا ٹرک پانی کی ٹنکی لاتا ہے اور ساری جگہ دھو جاتا ہے۔''

سکھ بیر آنکھیں پھیلا کر بولا! ''ہیں...... تایا جی پھر تو آپ جنت میں رہتے ہیں۔''

''نہیں اوے! جنت میں کالے پانی کی سزا ہے۔ سب کچھ ظاہری، مصنوعی اور بے رنگ دنیا ہے۔ جذبات، گہرائی، سچائی اور مزہ تو اپنے دیس میں ہے۔'' منجیت سنگھ اپنی مستی میں بولتا جا رہا تھا۔ بھتیجے سن رہے تھے اور منوندر پچھلی سیٹ پر ان سب باتوں کو ان سنا کرتی ہوئی سو گئی تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی بے جی، دار جی نے آشیرواد کے ساتھ دونوں کی پیشانی چوم لی۔ اوپر منزل پر ایک کمرہ ٹھیک کر دیا گیا تھا۔ ان کا سامان وہیں رکھ دیا گیا۔ جلدی جلدی کھانا کھلایا گیا۔ ایک بات نے دونوں کو متوجہ کیا کہ باورچی خانہ بھتیجوں کی بیویوں کے حوالے تھی اور ان میں سے کسی کا بھی سگھڑ عورت جیسا طور طریقہ نہیں تھا...... سبھی کام کو نمٹانے اور جلدی جلدی سمیٹنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی بے صبری صاف نظر آ رہی تھی۔

آدھی رات میں منوندر رفع حاجت کے لیے جب نیچے گئی، تو منجیت بھی اس کے ساتھ نیچے آیا۔

اوپر کوئی باتھ روم نہیں تھا۔ نئی جگہ اور گہرا اندھیرا تھا اور...... وہ جانتا تھا کہ وہ اندھیرے سے بہت ڈرتی ہے۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا...... ''میری رانی! کچھ دن تکلیف برداشت کر لے، میں تجھے بڑا اور اچھا سا گھر بنوا کر دوں گا۔ بہت سال تم نے انتظار کیا۔'' منوندر نے کچھ نہیں کہا۔ بس سانس لے کر چپ ہو گئی۔

دوسرے دن منجیت تو بھائی بھتیجیوں کے ساتھ کھیتوں میں چلا گیا۔ پورے گاؤں اور آس پاس کی اپنی زمینیں دیکھنے۔

منوندر بہوؤں کے ساتھ رسوئی میں جانے لگی تو بے جی نے ٹوکا۔ ''نہیں منی کچھ دن تاں آرام لے، کرن دے انہاں نو کم۔'' بے جی پیار سے منوندر کو منی کہتی تھیں۔

''بے جی میں خالی نہیں بیٹھ سکتی۔ ساتھ کام کروا دیتی ہوں۔ جلدی نپٹ جائے گا۔ کہہ کر وہ رسوئی میں چلی گئی۔

منوندر رسوئی میں گئی، تو تھوڑی دیر بعد سب بہوئیں ایک ایک کر کے وہاں سے کھسک گئیں۔ کوئی کپڑے دھونے اور کوئی کپڑے سکھانے کے بہانے۔ منوندر اکیلی ہی رسوئی میں لگی رہی۔ اسے تو ہر طرح کے کام کی عادت تھی۔ امریکہ میں حلوائی، دھوبی، باورچی، مہترانی وہ خود ہی تو تھی۔ اسے حیرانی اس بات کی ہوئی کہ ایک بھی دیورانی اس کا ساتھ دینے نہیں آئی۔ ایک سر میں تیل لگاتی رہی۔ دوسری بے جی اور اپنے جسم کی مالش کرتی رہی۔ وہ اس سے بے پروا، بے خبر دھوپ میں بیٹھی اپنا جسم سہلاتی رہی۔

سارا کنبہ جب تھکا ہارا گھر لوٹا تو منوندر نے بڑے پیار اور محبت سے سب کو کھانا کھلایا۔ لکھی سے رہا نہیں گیا، کہہ ہی دیا اس نے...... بھابھی، بے جی دی رسوئی دی یاد آ گئی، آپ دیاں چھوٹیاں دیوارنیاں تاں نکمیاں نے، نواں انہاں تو وی گیاں گذریاں، بے جی تاں سب کچھ چھوڑ چھٹر کے بیٹھ گئے، انھوں نے عقل کون دے؟''

''ویرا! ایسا نہیں کہتے گھر کی عورت کو۔ وہ تو لکشمی کا روپ ہے۔ اس کو عزت دیتے ہیں۔ چاہے وہ کیسی بھی ہو! منوندر نے مسکرا کر کہا۔

مسکرا کر ہی تو لکھی نے پوچھا تھا...... ''بھرا جی، کتنے دن رہن دا ارادے ہیں۔ کمرہ چھوٹے کا کے دے۔ دونوں میاں بیوی ڈرائنگ روم وچ سوندے نے۔''

ہم یہاں ہمیشہ کے لئے آپ لوگوں کے ساتھ رہنے خاندان کی دھوپ چھاؤں کا آنند لینے آئیں ہیں۔ منجیت نے اپنے دار جی سے کہا۔ اتنا سنتے ہی سب کے چہروں کے رنگ بدل گئے۔ بے رخی سی جھلک آئی۔ ان سب کے مسکراتے چہروں پر۔ بچے تاں امریکہ نے انھوں تو ہنا تیرا دل کج لگے گا؟ بے جی نے بڑے سادے انداز میں کہا۔

بے جی ہر سال ہم انھیں وہاں ملنے جائیں گے اور چھٹیوں میں وہ یہاں ہمارے پاس آئیں گے۔ امریکا میں میں نے آپ سب کو بے انتہا یاد کیا۔ یہاں آنے کے بعد آپ سب کو بہت Miss کرتا رہا۔ ماں آپ میرے دل میں ہر وقت رہیں ہیں۔

''تسیں سالاں بادوی''۔

''ہاں ماں تسیں سالاں بادوی۔ جہاں ملی روٹی وہاں باندھی لنگوٹی...... امریکا کے اس کلچر کو، میں اپنا نہیں پایا۔ آپ کو پتہ نہیں، میں نے وہاں دن کیسے کاٹے؟'' منجیت نے وہاں زندگی کیسے گذارا۔ کسی نے یہ جاننے کی دلچسپی نہیں دکھائی۔

لکھی کا چہرہ سخت ہوگیا۔ زمینوں پر حق جتانے آئے ہو؟

حق کیسا لکھی۔ میں نے ہی تو پیسہ بھیجا تھا۔ ساری زمینیں ہم سب ہی کی تو ہیں۔ ایک ٹکڑا بیچ کر اپنا گھر بنوالوں گا۔ تاکہ سب آرام سے رہ سکیں۔ منجیت نے مضبوط لہجے میں کہا۔

بے جی کی کڑکتی آواز ابھری۔ تسیں سال پہلاں میرا پتر میں تھوں کھوں لیا۔ ہن زمینیاں...... اے سب تیرے کارنامے نے، میرا منجیتا انج دا نہیں اے، کنجریئے''۔

منجیت اور منوندر دم بخود رہ گئے۔

صبر کا دامن چھوڑتے ہی شرم کا پردہ بھی ہٹ گیا۔ منوندر بھڑک اٹھی ...... پانی وار کر آپ ہی نے کہا تھا۔ تو ایسی سنبھال میرے پترنوں، تیرے حوالے کیتا۔ اس نو امریکا وچ پکا کروادئیں۔ ڈالراں نے تاں پنڈ دے پنڈ امیر کردیے نے۔ اس دی کمائی ساڈی وی غریبی ہٹا دیوے گی۔

غریبی تو ہٹ گئی، پر پیسے کی گرمی نے رشتے ٹھنڈے کر دیے۔ اس عمر میں کفر نا تولیں۔ بے جی۔ رب سے ڈریں۔ منجیت آپ کا سوتیلا بیٹا نہیں، آپ کا حصہ ہے۔ کیوں آپ مجھے گالیاں دے کر منہ گندا کر رہی ہیں۔ ہم کچھ چھیننے نہیں آئے۔ بس آپ کے دلوں میں تھوڑی سی جگہ چاہتے ہیں۔ برسوں سے آپ کے نام کی مالا جپنے والا آپ کا پتر یہیں رہنا چاہتا ہے آپ کے پاس۔

دار جی بنا کچھ کہے اٹھ گئے اور ان کے ساتھ ہی سب اپنے کمروں میں چلے گئے۔

کچھ دن دونوں کے لیے بہت تکلیف دہ رہے۔ گھر میں سب نے بول چال بند کر دی تھی۔ منجیت اپنے ہی گھر میں اجنبی بن گیا تھا۔ منوندر کا غصہ اس کی بے بسی دیکھ کر ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ وہ اس کے لیے فکر مند ہو اٹھی تھی۔ خاندان کے تئیں اس کے جذبات منوندر سے چھپے نہیں تھے۔ جانتی تھی کہ وہ کتنی شدت سے اپنے گھر والوں کو چاہتا ہے اور ان کے رویے نے اس کو اندر تک توڑ دیا تھا۔ وہ خود ہی کھانا بناتے، اکیلے کھاتے، سب ان سے کٹے کٹے، دور دور رہتے۔

منجیت اب بھی اپنے پرانے بے جی، دار جی اور بھائیوں کے خواب دیکھتا۔ نیند ٹوٹنے پر کروٹیں

بدلتے ساری رات گذر جاتی۔ موجودہ حالات اسے ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ وہ یہ قبول نہیں کر پا رہا تھا کہ ماں باپ بھائی ایسے کیسے اتنا بدل سکتے ہیں۔ زمینوں نے رشتے بانٹ دیے تھے۔ جن پر منجیت نے ساری عمر فخر کیا تھا۔ دل و دماغ میں کشمکش جاری تھی۔ کبھی دل ارجن بن کر رشتوں کے جذباتی پہلو کی دہائی دیتا اور کبھی کرشن بن کر حق کے لیے لڑنے کو اکساتا۔ اگر رشتے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں تو انھیں کھولنا ہی پڑے گا اس کے اندر مہابھارت چھڑی ہوئی تھی۔ جذبات پانڈو بن کر کوروں بنے رشتوں کا انداز اور رویہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اس کا قصور کیا تھا؟ رشتوں کو حد سے زیادہ چاہنا یا اس چاہت میں سب کچھ بھول جانا اور خود کو مٹا ڈالنا۔ رشتوں کے لاکشا گرہ کے جلنے سے زیادہ وہ بے جی، دار جی کے بدلتے ہوئے مزاج اور اقدار سے زخمی ہوا تھا۔

اسی کشمکش میں وہ ایک رات پانی پینے اٹھا تو نیچے کمرے میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ پتہ نہیں کیوں شک سا ہوا دبے پاؤں وہ نیچے آیا۔ دار جی کے کمرے سے پھسپھساہٹ اور دبی دبی آوازیں آرہی تھیں۔ دونوں بھائی دار جی سے کہہ رہے تھے، ''منجیتے کو سمجھا کر واپس بھیج دو، نہیں تو ہم کسی سے بات کر چکے ہیں، پولیس سے بھی سانٹھ گانٹھ ہو چکی ہے کیس اس طرح بنائیں گے کہ پرانی رنجش کے چلتے واپس لوٹ کر آئے N.R.I. کا قتل۔ کیس اتنا کمزور ہوگا اور جلدی ہی رفع دفعہ ہو جائے گا، بے شک امریکہ کی سرکار بھی ڈھونڈتی رہے۔ کوئی سراغ نہیں ملے گا، ایسی اٹی سٹی (Planing) کی ہے'' یہ سن منجیت کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا اور وہ وہاں کھڑا نہیں رہ سکا۔ جسم کی ساری توانائی کہیں ہوا ہوگئی۔ بدن ٹھنڈا ہوگیا۔ چلنے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا...... وہ کمرے میں لوٹا اور بستر پر دھڑام سے گر گیا۔ منوندر کی نیند ٹوٹ گئی، وہ اس کے کانپتے جسم اور چہرے کے اڑے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بہت گھبرا گئی۔ منجیت بائیں طرف اپنے دل پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔

''سردار جی، درد ہو رہا ہے تو ڈاکٹر کو۔۔۔۔ منوندر نے اپنی بات ابھی پوری نہیں کی تھی کہ منجیت نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا...... ''درد نہیں، دل ٹوٹا ہے، اپنوں نے توڑا ہے۔ ٹوٹے دل کے ٹکڑے سنبھال نہیں پا رہا ہوں۔ تیری باتوں کو ان سنا کر، میں ساری عمر تجھے پرائی سمجھتا رہا اور اب اندر جو تڑپ ہے، جو سن کر آیا ہوں، کیا وہ سچ ہے؟ جان نہیں پا رہا ہوں کون سی زمین اپنی ہے؟''

منوندر نے اپنی انگلی منجیت کے ہونٹوں پر رکھ کر، اسے چپ کرا دیا۔ وہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی اور اچھل کر بستر سے نیچے اتری۔ مضبوط قد کاٹھی کی منوندر نے منجیت کو بانہوں میں بھر کر اٹھنے میں مدد کی۔ اپنا پرس اٹھایا اور آدھی رات میں ہی دونوں پچھلے دروازہ سے نکل گئے۔ ان کے پاؤں کے نیچے وہی زمین تھی، جس کے لیے منجیت عمر بھر ڈالر بھیجتا رہا۔ چاروں طرف گھرا کالا اندھیرا تھا۔

☆☆☆